ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر محمد یار گوندل❁

اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی''، ''تاریخِ تصوف'' اور خانگی زندگی: چند معروضات

Iqbal's *Asrar-e-Khudi*, *Tareekh-e-Tasawwuf* and personal life: Some Assumptions

By *Dr. Muhammad Yar Gondal, Asst. Prof., Department of Urdu Language & Oriental Languages, University of Sargodha.*

Abstracts

In this article, I want to present some hypothesis (assumption) about *Asrar-e-Khudi* and *Tareekh-e-Tasawwuf*, a number of objections were raised in this regard. In which *Asrar-e-Khudi* being in Persian instead of Urdu, *Preface*, Dedication of book *Asrar-e- Khudi* to Sir Imam Ali, about his status in society, title of "Sir" to Iqbal being seen as loyalty to British Government and about his personal marriage life especially his first wife and son Aftab Iqbal are being questioned. Objections on his famous poems *Shikwa* and *Jawab-e-Shikwa* were raised by his literary opponents. Objection regrading point of view of Iqbal on Hafiz Shirazi's poetry was also raised. It was also questioned why Iqbal used to prefer Persian poetry over Urdu. In this article the attempt has been made to answers these objections.

Keywords: Assumptions, Iqbal, *Asrar-i-Khudi*, *Tareekh-e-Tasawwuf*, Personal life, Hafiz Shirazi, Urdu, Persian.

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو و مشرقی زبانیں، سرگودھا یونی ورسٹی، سرگودھا

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

اقبال کی شخصیت بعد از وفات بھی معترضین کے اعتراضات کی آماج گاہ بنی رہی اور بنی ہوئی ہے۔ علامہ اقبال کے فن اور زندگی کو دانستہ طور پر ہدف بنانے کی کوشش آج بھی جاری ہے اور اِس موضوع پر تحقیق و تنقید کی ابتدا کرنے سے پہلے ہی دانستہ طور پر ایک روڈمیپ تیار کر لیا جاتا ہے جس میں بغیر ثبوت الزامات لگائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اختلاف اور انکار دو ایسے الفاظ ہیں جو الگ الگ معانی کے متحمل ہونے کے باوجود اقبالیات کے ضمن میں ہمیشہ ایک ہی معانی کے حامل قرار پاتے رہے ہیں گویا دوسرے لفظوں میں فکرِ اقبال کے کسی پہلو سے اختلاف کو اُس سے انکار کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔[1] یہ درست ہے کہ اختلاف اور انکار اپنے الگ الگ معانی رکھتے ہیں اور طبع سلیم رکھنے والوں کا اختلاف بھی تعمیری اور مثبت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انکار اگر محض ہٹ دھرمی پر مبنی ہو تو وہ ایک منفی رجحان ہے۔ اِس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال محض شاعر اور فلسفی ہی نہ تھے بلکہ ایک بندہ بشر بھی تھے۔ دوسرے یہ کہ علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر اُن کی زندگی میں ہی اختلاف اور انکار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو اُن کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ معقول اختلاف ہمیشہ معقول دلائل کی روشنی میں ہی کامیاب ہوتا ہے ورنہ وہ محض انکار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی انسان بھی مکمل نہیں۔ قوموں کی تقدیریں بدلنے والے بڑے لوگوں کی ذاتی زندگیاں محرومیوں اور ناکامیوں کے دکھوں سے مبرا نہیں۔ یہ لوگ بڑے بڑے مقاصد کی تکمیل کی بھاگ دوڑ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ذمے داریوں کو بھول جاتے ہیں۔ اِن غلطیوں کو مخالفین اُن کی کردار کشی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ روزِ اول سے چلا آرہا ہے۔

یہاں پہلے اُن اعتراضات کو پیش کیا جاتا ہے جو علامہ اقبال پر عائد کیے جاتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے 'اسرارِ خودی' فارسی زبان میں کیوں لکھی حالانکہ اِس سے پہلے اقبال اُردو میں کم و بیش اتنے اشعار ضرور کہہ چکے تھے کہ ایک ایسا مجموعہ تیار کر سکتے تھے۔ اِس ضمن میں عموماً 'زندہ رُود' سے حوالہ دیا جاتا ہے کہ بقول اقبال بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اِس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی ابتدا میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ بعض حضرات اقبال کی اپنی اِس وضاحت سے مطمئن نہیں اور طرح طرح کے سوالات اٹھاتے ہیں۔ مثلاً اقبال ایسا کیوں چاہتے تھے کہ اُن کے خیالات کم سے کم لوگوں تک پہنچیں۔ انھیں کیا خوف تھا کہ وہ مثنوی کی اشاعت سے پہلے ہی اسے مخصوص حلقے تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

اس ضمن میں مولانا گرامی کے خط کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے کہ اقبال اُردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتے جارہے تھے اور فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جارہا تھا۔اُن کے دل کا بخار اُردو کی بجائے فارسی میں زیادہ نکلتا تھا۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اقبال اُردو زبان سے بھی خائف تھے لیکن ایسی بات نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے اُردو قارئین سے ڈرے ہوئے تھے کہ اگر اُردو قارئین کو آگہی ہوگئی تو وہ اپنے دل کا بخار نکالنے میں پیچھے نہیں رہیں گے۔(۲) یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کے عظیم اشخاص کی ذات بڑے بڑے اضداد کا مرقع رہی ہے۔مثلاً افلاطون جسے فکرِ انسانی کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے،اس کے افکار اور شخصیت تضادات کا مجموعہ ہیں۔جرمن فلاسفر کانٹ اور گوئٹے کی شخصیت اوراقوال میں تضادات ملتے ہیں۔اسی طرح اقبال کے ہاں بھی ایسی صورت حال ملتی ہے۔اصل میں ایسی شخصیات فکری تضادات کو دُور کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔(۳)

کسی بھی فن کا پہلا نقاد خوداُس فن کا خالق ہوتا ہے۔اِسی بنا پر غالب نے بھی دیوانِ ریختہ کا انتخاب کیا اوراپنے بیان کی وسعت کے لیے ، یے ہگہ ب ماے غزل کا شکوہ بھی کیا۔بڑے فن کار کے ہاں خوداحتسابی کا عمل ہمیشہ جاری رہتاہے۔جیسا کہ خود اقبال نے کہاہے:

صورتِ شمشیر ہے، دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں، اپنے عمل کا حساب

وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کے نظریات میں بھی تبدیلی آتی رہی۔جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو اقبال بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اوراِس نظام کی تعریف بڑے شدومد کے ساتھ کی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب اس نظام کی قباحتیں سامنے آنے لگیں تو اقبال کے نظریے میں بھی تبدیلی آگئی۔اِسی طرح وطنیت سے ملت کی طرف مراجعت میں بھی بظاہر تضاد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔لیکن حالات وواقعات نے یہ نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔وطن سے باہر جاکر اقبال کو یہ احساس ہوا کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں کیوں کہ مغرب کی جن قوموں نے اِس اصولِ زندگی کو اختیار کیا ہے،وہ انتہا درجے کی خود غرض ہوگئی ہیں،ملک گیری اوراستحصال کی حرص وآز،غرض پرستی اور لوٹ کھسوٹ کا نام ہے تو یہ کسی آبرومند قوم کا نصب العین نہیں ہوسکتی۔علاوہ بریں جب اقبال نے دنیاے اسلام کے جمود،مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیمات اسلامی کی کسمپرسی کو دیکھا تو انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات سے رجوع کر کے اپنا مسلک یہ قرار دیا کہ ملتِ اسلامی کو بیدار کیا جائے،اس کو اقدار واخلاقِ اسلامی سے ازسرنو آشنا بنایا جائے اوراِس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر حرم کا رستہ دکھایا جائے۔اُن کو صاف نظر آگیا کہ مغربی تہذیب

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

وترقی کی بنیاد اخلاقِ عالیہ کی چٹان پر نہیں بلکہ زر پرستی کی ریت پر ہے اِس لیے یہ عمارت مستقبل قریب میں پیوندِ خاک ہونے والی ہے، چناں چہ "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا" والی نظم میں انھوں نے واشگاف طور پر اپنے خیال میں ظاہر کر دیا۔(۴)

یہ درست ہے کہ اقبال فارسی میں باقاعدہ شعر کا آغاز کرنے سے پہلے اُردو شاعری میں نام پیدا کر چکے تھے۔ اُردو میں اُن کی بعض مشہور نظمیں معرضِ وجود میں آچکی تھیں اور انھیں برصغیر کے طول و عرض میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اقبال سے کم و بیش ایک صدی قبل مرزا غالب کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ غالب کا متداول دیوان اُن کی عمر کے اٹھارہ بیس سالوں میں مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن وہ کیا وجوہات تھیں کہ اس کے بعد غالب نے فارسی کی طرف مراجعت کی اور اپنی فارسی شاعری پر ناز کیا ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگِ من است

گو اس تبدیلی کے محرکات کچھ بھی ہو سکتے ہیں جس میں ذوق سے پیشہ ورانہ رقابت اور اپنی شاعری کی ناقدری بھی شامل ہے۔ ویسے ایک عجیب اور ناقابل تشریح بات یہ بھی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں فارسی کا چلن ختم ہوتا جا رہا تھا اور بادشاہ تک اُردو شاعری کر رہے تھے۔ حالانکہ غالب نے دیوان اُردو شائع کیا تھا جس کی پذیرائی بھی ہوئی۔ اس کے باوجود غالب اُس دور میں اپنے فارسی کلام کی برتری پر اصرار کرتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کو اپنی اُردو شاعری کی عظمت کا ادراک نہیں تھا۔ اس کے باوجود اُن کا اصرار تھا کہ فارسی کلام اُن کو زیادہ عزیز ہے۔ ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ میرے کلام کی گونج فارسی دنیا کو سنائی دے۔ اِسی طرح پچاس سال بعد اقبال نغمہ سرا ہوتے ہیں جن کا بیسویں صدی کے آغاز میں فارسی کی طرف مائل ہونا اور بھی ناقابل تشریح تھا۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب کی روح اقبال میں حلول کر گئی ہے۔(۵) اقبال نے خود بھی متعدد موقعوں پر اِس امر کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے اپنا فلسفہ حیات پیش کرنے کے لیے فارسی کو کیوں منتخب کیا، اس کے متعلق خود کہا ہے:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت — خامہ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام — در خورد بافطرت اندیشہ ام

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

گویا شاعر کے فکر کی ماہیت اور رفعت نے اِس زبانِ شیریں کو اپنے اظہار کے لیے زیادہ موزوں اور ہم آہنگ پایا۔[۶]

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک مرتبہ اقبال سے پوچھ لیا کہ آپ نے اُردو میں لکھنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ فارسی میں لکھنا بجا مگر اُردو کا بھی تو کچھ حق تھا۔ اقبال کچھ دیر خاموش رہے، اور بالآخر انھوں نے انگریزی میں فرمایا کہ It comes to me in Persian (مجھ پر شعر وارد ہی فارسی میں ہوتا ہے۔)[۷]

علامہ اقبال جب گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں قیام پذیر تھے تو اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو اُن کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ موقع پر ڈاکٹر ، ، کلسن (جو کیمبرج یونی ورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی کے استاد اور اسرار خودی کے مترجم بھی تھے) نے بھی خطاب کیا۔ اِس دعوت میں علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے دوران فارسی زبان میں شعر گوئی کے متعلق کہا کہ بعض اصحاب خیال کرتے رہے ہیں کہ میں نے فارسی زبان اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اِس کے بالکل برعکس تھا، میں نے اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' ابتدا میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی، اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں، وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اُس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی، یا سمندر چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اس زبان میں شعر کہتا رہا۔[۸]

دوسرا اعتراض یہ کہ اقبال نے 'اسرارِ خودی' کی اولیں اشاعت میں اسے سر امام علی کے نام معنون کیا تھا لیکن اشاعت دوم (۱۹۱۸ء) میں یہ انتساب حذف کر دیا گیا۔ اس اعتراض کے لیے بھی ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب 'زندہ رُود' سے حوالہ دیا ہے کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ہو اور قوم کو خودداری کی تعلیم دی گئی ہو اسے سرکاری خطاب یافتہ اور دنیا دار کے نام معنون کیوں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ خطاب یافتہ ہونا اس قدر غلط امر تھا تو اقبال نے یہ اعزاز خود کیوں قبول کیا؟ اس بارے میں معترضین کا خیال ہے کہ اقبال سر امام علی کے توسط سے حیدرآباد میں کوئی بڑا عہدہ لینے کے خواہاں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر امام علی اور اقبال کا تعلق دوستی اور محبت و اخلاص پر مبنی تھا جیسا کہ اقبال کا تعلق کرشن پرشاد شاد کے ساتھ تھا حالانکہ اُن کا مسلک بھی اور تھا۔ اس حوالے سے اقبال نے خود بھی وضاحت کی ہے ڈیڈ کیکیشن کا مطلب تذلیل نہیں جیسا کہ کوئی مرید اپنے پیر کے آگے سجدہ کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے تو درست نہیں ڈیڈیکیشن سے مراد محض اظہارِ محبت و اخلاص ہے جو دو آدمیوں کے ذاتی

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔(۹)

سر امام علی ۱۹۱۹ء میں وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن ہوئے جب کہ مثنوی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس انتساب میں کل انیس اشعار تھے جن میں گیارہ اشعار اقبال کے اپنے حوالے سے تھے۔ لہٰذا اقبال کو مثنوی معنون کرتے ہوئے یقیناً معلوم نہیں تھا کہ سر امام علی چار سال بعد وزیر اعظم بن جائیں گے۔ غالب کی طرح اقبال بھی معاملہ فہم اور طبع سلیم رکھنے والے افراد کی قدر دانی کے قائل تھے۔ سر امام علی وائسرے کی کونسل کے ممبر اور وزیر قانون بھی تھے۔ اُن ہی کی مساعی کی بنا پر ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا اور بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے الگ صوبہ بنایا گیا۔ سیاست میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ در حقیقت اس انتساب کو صرف ایک عام سی مدحیہ نظم مان کر پڑھا اور سمجھا گیا۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ علی امام کا قصیدہ ہے۔(۱۰)

تیسرا اعتراض یہ کہ اشاعت دوم میں اس مثنوی کا وہ دیباچہ بھی حذف کر دیا جس پر انھیں اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ دیباچے میں آخر کون سی ایسی بات تھی جس کے پیش نظر اقبال کو یہ قدم اُٹھانا پڑا اور کیوں؟ اس حوالے سے مختصر دیباچے اور حافظ کے حوالے سے جو اعتراضات ہوئے تھے، اُن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تحریر میں ایجاز و اختصار بعض دفعہ ابہام کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔ اِسی لیے اقبال نے مثنوی کی اشاعت دوم میں اسے حذف کر دیا۔ اس کے علاوہ بعض اصحاب نے حافظ پر تنقید کو اپنی کم فہمی کی بنا پر تنقیص سمجھا اور طرز کہن پر اَڑنا کی روایت پر عمل پیرا ہو گئے۔ اقبال ادب برائے مقصد کے داعی تھے۔ اس سے پہلے سر سید احمد خاں اور حالی کے نظریات بھی افادی ادب کے تھے جس سے اقبال نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان شخصیات کے معترف بھی تھے جن کی سوچ کا زاویہ درست سمت میں گامزن تھا۔ اس حوالے سے اقبال کی ایک نظم "سید کی لوحِ تربت" جو "بانگِ درا" میں شامل ہے، ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ وہ حافظ کے فن کے معترف بھی تھے لیکن ادب کو محض لذت، لطف اور جذبات افروزی تک محدود رکھنے کے مخالف تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میرے قالب میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں۔ بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کاروباری قسم کی ہے اور اندرونی شخصیت تخیل، تصوف اور تصور کا پیکر ہے۔ جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں، اُس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہو جاتی ہے۔ گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔(۱۱)

ایک اعتراض خواجہ حسن نظامی کے حوالے سے کہ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کرتے وقت اُس میں قرآنی آیات واحادیث کے حوالہ جات اور تراجم وغیرہ شامل کرنے کے لیے اُسی خواجہ حسن نظامی سے رہنمائی لیتے رہے تھے۔ اقبال

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

جن امور میں خواجہ حسن نظامی سے رہنمائی لیتے رہے ،اُس کا تحقیقی لوازمہ یورپ میں کم یاب تھا۔ لازم نہیں کہ بندہ ہر فن مولا ہو۔ اگر کوئی شخص ایک فن میں طاق ہو تو ضروری نہیں کہ وہ دیگر فنون میں بھی ماہر ہو۔ یہ درست ہے کہ خواجہ حسن نظامی اسلامی شریعت میں خاصی دست رکھتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں کہ طریقہ ی معاملات میں بھی اُتنا ہی درک رکھتے ہوں۔ اس حوالے سے کئی ادبی شخصیات کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو ادب کی ایک خاص جہت میں مسلم الثبوت حیثیت رکھتے ہیں جب کہ بعض ادبی جہات میں مبتدی کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اِسی بنا پر اکبر الٰہ آبادی کو خواجہ حسن نظامی کو سمجھانا پڑا کہ آپ اس مسئلے کو قرآن کی رُو سے حل نہیں کر پائیں گے۔

اس ضمن میں مرزا غالب کے ایک خط کی تحریر ذہن میں آتی ہے جس کا پس منظر "قاطع برہان" کے ادبی مناقشے سے تھا۔ حافظ کی طرح قتیل کو بھی اہلِ ہندوستان، لغت میں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" سمجھتے تھے۔ سو وہ "برہان قاطع" کی اغلاط کو اندھی تقلیدی روش کی بنا پر برداشت نہ کر پائے اور غالب کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ غالب نے اِس کا اظہار بھی کیا کہ "قاطع برہان" کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس شخص میں کئی باتیں بیک وقت پائی جائیں۔ وہ عالم ہو، فنِ لغت کو جانتا ہو، فارسی زبان وادب کا شناور ہو، اساتذہ سلف کا کلام نظر سے گزرا ہو بلکہ کچھ یاد بھی ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، طبعِ سلیم رکھتا ہو، کج فہم اور معوج الذین نہ ہو۔ سو نہ یہ سب باتیں بیک وقت کسی میں جمع ہوں گی اور نہ ہی کوئی اس محنت کی داد دے پائے گا۔(۱۲)

چوتھا اعتراض یہ کہ اقبال تصوف پر ایک جامع اور مبسوط تصنیف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس ضمن میں وہ کتاب کا خاکہ بھی تیار کر چکے تھے۔ لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ منصور حلاج کے حوالے سے بھی ایسا ہی طوفان اٹھنے کا اندیشہ تھا جیسا حافظ کے حوالے سے اٹھا تھا۔ یہ بات کسی حد تک درست کہی جا سکتی ہے کیوں کہ منصور حلاج کے حوالے سے بھی لوگوں کی عقیدت حافظ اور قتیل جیسی تھی۔ اقبال کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ تصوف پر ایک جامع اور مفصل کتاب تحریر کریں تا کہ اُردو خواں طبقہ آسانی سے سمجھ سکے اور اِس کے لیے تحقیقی لوازمہ بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہر فن کار مستقبل کے بارے میں کچھ تصنیفی و تالیفی منصوبے ذہن میں رکھتا ہے اور بعض دفعہ کسی کے استفسار پر اور بعض دفعہ نادانستہ اُس کی تقریر و تحریر میں اُن کا ذکر آتا رہتا ہے۔ مکاتیبِ اقبال سے اُن کے کئی تصنیفی منصوبوں کا علم ہوتا ہے جن کے مطابق وہ قرآن، فقہ، تصوف اور اجتہاد وغیرہ کے متعلق مندرجہ ذیل مضامین اور کتب لکھنا چاہتے تھے:

۱۔ مقدمہ القرآن ۲۔ اسلامی تصوف کی تاریخ

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

۳۔ حیات مستقبلہ اسلامیہ ۴۔ قلب و دماغ کی سرگزشت
۵۔ اسلامی فقہ کی تاریخ ۶۔ تاریخ ادب اُردو
۷۔ فصوص الحکم پر تنقید ۸۔ رامائن (اُردو میں)
۹۔ The Book Of Forgotten Prophet(۱۳)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''شکوہ'' کے بعد کن معروضی حالات سے سمجھوتے کی صورت میں 'جواب شکوہ' لکھی۔ اقبال امت مسلمہ کی زبوں حالی، تن آسانی اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنے پر ہمیشہ بے قرار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال کا سہ سالہ قیامِ یورپ، سلطنت اسلامیہ کا بکھرتا ہوا شیرازہ، ملت اسلامیہ کا عمومی زوال 'شکوہ'، 'جواب شکوہ' اور 'شمع و شاعر' جیسی نظموں کی تخلیق کا سبب بنے۔ اُردو شاعری میں خدا سے شکوہ اور تخاطب کا انداز اقبال سے پہلے غالب کے ہاں نظر آتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے(۱۴)

'جواب شکوہ'، 'شکوہ' کے جواب میں ضروری دتھلرے بعض اصحاب نے اسے شوخی اور گُستاخی سمجھا۔ حالانکہ صوفیہ کے ہاں خدا سے شوخی کا انداز اس سے بھی فزوں تر ہے۔ علامہ اقبال سے بہت پہلے صوفیہ اپنی شطحیات میں اقبال سے بھی زیادہ گستاخانہ اندازِ تخاطب اختیار کر چکے ہیں۔(۱۵) اصل میں اُن کے تخیل کی فلسفیانہ دقت طرازیاں بھی بعض اوقات اشعار کی تہہ تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہیں۔ اسی لیے اقبال کی شاعری محض تفریح کی غرض سے پڑھنے والوں کے لیے مایوسی کا سبب بنتی ہے۔ اِسی بنا پر وہ حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

یہ انھی دقت طرازیوں کا نتیجہ ہے کہ اُن کا کلام ہمیشہ معرض بحث رہا ہے اور ایک عرصہ تک رہے گا۔(۱۶)

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

یہ سوال بھی کہ اقبال نے اپنے خطبات کے لیے ذریعہ اظہار کے طور پر انگریزی زبان کا انتخاب کیوں کیا جب اپنی نگرانی میں ہی بعد ازاں اس کا اُردو ترجمہ بھی کرایا تھا؟ اِس ضمن میں عرض ہے کہ اِن خطبات کا موضوع دقیق فلسفیانہ مسائل تھے اور اِس قسم کے موضوعات کے لیے ابھی اُردو منت پذیر شانہ تھی۔ دوسرے اِن موضوعات پر اقبال کا مطالعہ زیادہ تر انگریزی کتب پر مبنی تھا۔ اِس بات کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کی وفات کے بعد اُن کے ذاتی ذخیرہ کتب میں چودہ سو کتب موجود تھیں جن میں صرف چالیس کتب فارسی اور اُردو کی تھیں، بقیہ سب انگریزی کی تھیں۔ یوں اُن کو انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں سہولت تھی۔ دوسرے یہ خطبات انگریز مشنریوں کے جواب میں تھے تو ضروری تھا کہ جواب بھی انھی کی زبان میں دیا جائے۔ اِسی حوالے سے اقبال نے کہا ہے کہ یہ اُردو خواں طبقے کے لیے مفید نہیں۔ بعد میں جب سید نذیر نیازی نے ترجمہ کی اجازت چاہی تو اقبال نے اجازت دے دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ترجمہ مجھے دکھاتے بھی رہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ترجمے میں ابہام کا عنصر کم سے کم ہو اور اُردو خواں طبقہ بھی کچھ مستفید ہو سکے۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اقبال متحدہ ہندوستان کے حامی تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ آزمودہ اور منجھے ہوئے سیاست دان نہ تھے۔ سیاست میں اُن کا شامل ہونا بنیادی طور پر مسلمانوں کے لیے اُن کے اندر دردِ دل ہونا تھا۔ اِسی لیے انھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا۔ لیکن اگر خطبہ الٰہ آباد کو پڑھنے کی تکلیف گوارا کر لی جائے تو اس میں انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص علاقے کی نشان دہی بھی کر دی تھی۔ ظاہر ہے جب مخصوص علاقہ نشان زد کیا تو اُس کا مطلب واضح ہے کہ الگ ملک ہونا چاہیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال نے اپنی فارسی شاعری میں جس فلسفیانہ فکر کا تانا بانا بنا ہے، اُردو شاعری میں وہ کیوں مفقود ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ اسرار خودی کی اشاعت سے پہلے متعدد اُردو نظموں میں بھی تصورِ خودی کی جھلکیاں موجود ہیں، جیسے 'شمع و شاعر' (فروری ۱۹۲۱ء) کا دسواں بند:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو ، کھیتی بھی تو ، باراں بھی تو ، حاصل بھی تو

یا گیارھواں بند:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے

یا 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' (۱۲-۱۹۱۱ء) جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

کبھی اے نوجواں مسلم تد بّر بھی ُ کیا نو

وہ کیا گردوں تھا ُ جس ہو کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا[۱۷]

حالانکہ اُن کے تصورِ بے خودی کا اظہار بھی اُردو نظموں میں ملتا ہے۔ مثلاً ترانہ ملی، شکوہ، شمع وشاعر اور بزم انجم میں بھی موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ اقبال کی اسرار خودی کا بڑا محرک مثنوی مولانا روم تھی جس سے وہ بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی مثنوی میں وہی بحر اختیار کی جو رومی کی مثنوی کی ہے۔ خود رومی نے یہ بحر شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر سے متاثر ہو کر منتخب کی تھی۔ اس بحر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فکر کو سوزوساز کے ساتھ سمونے کی صلاحیت ہے۔ مرزاغالب نے بھی مثنوی ''چراغِ دَیر'' میں وہی بحر یعنی بحر ہزج مسدس محذوف استعمال کی ہے جو اُن سے پہلے بیدل نے ''طورِ معرفت''، منیر لاہوری نے ''درصفت بنگالہ'' اور غنیمت کنجاہی نے ''نیرنگ عشق'' میں اختیار کی۔

معترضین کہتے ہیں کہ سیاست میں جناح کے ساتھ اُن کی کیوں نہ بن پڑی؟ اور بطور ہیرو جس طرح اقبال قابلِ قبول رہے، محمد علی جناح کیوں نہ رہے؟ پہلی بات یہ کہ اقبال شاعر تھے، سیاست دان نہ تھے اور شاعر کی منطق، شاعرانہ منطق ہوتی ہے۔ وہ تو صرف خواب دیکھتا ہے اور جو اِس خواب کو سمجھ جاتے ہیں وہ اُسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس موقع پر ایک برمحل واقعہ یاد آتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ لاہور آئے اور اقبال سے اپنے بے تکلفانہ انداز میں کہنے لگے ظالم! ہم تو ر ی ہ ھارے شعر پڑھ پڑھ کر جیل جاتے ہیں، لیکن تم دُھسا اوڑھے، حقے کے کش لگاتے رہتے ہو۔ اقبال نے برجستہ کہا کہ میں تو قوم کا قوال ہوں اور قوال خود وجد و حال میں شامل نہیں ہوتا، ورنہ قوالی ہی ختم ہو جائے۔[۱۸]

اقبال کی خانگی زندگی پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ پہلا یہ کہ اقبال اپنی خانگی زندگی میں آخر کس نفسیاتی الجھاؤ کا شکار تھے جو ایک انجان پتے سے موصول ہونے والے خط پر یوں تذبذب کا شکار ہوئے کہ اُن کی دوسری شادی دراصل تیسری شادی بن گئی۔ دوسرا یہ کہ فکرِ اسلامی کے مبلغ اقبال عملی زندگی میں بالخصوص وراثت کے حوالے سے مذہبِ اسلام کے اُصولوں پر کس قدر عمل پیرا ہیں۔ عرض ہے کہ کسی بھی فن کار کے فن کو اُس کی شخصیت کے ساتھ ملا کر جائزہ لینے سے اکثر مایوسی ہی ہوتی ہے اور اِس کی بین مثال مرزا غالب کی ہے جو اپنی شاعری میں اَنا کی ثریا تک پہنچتا ہے جب کہ عملی زندگی میں ایک گدائے مبرم نظر آتا ہے۔ گویا صاف نظر آتا ہے کہ شاعر غالب کوئی اور ہے اور شخص غالب کوئی اور ہے۔ گم نام خط کے حوالے سے اقبال کا ردعمل ایک حساس انسان کا ہے اور یہ عین فطری ہے۔ لیکن جب اقبال کو سردار بیگم نے براہِ راست خط لکھا اور کہا کہ آپ نے سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں اور قیامت کے دن اس کی

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

جواب دہی ہو گی اور ساتھ ہی تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ گم نام خط کسی وکیل نے، جو اپنے بیٹے کی شادی سردار بیگم سے کرنا چاہتا تھا، لکھا تھا۔ اِس طرح اقبال کا تردد رفع ہو گیا۔ اقبال کے بیٹے آفتاب اقبال اپنی ماں کی قربت کی بنا پر باپ سے دور ہوتا گیا اور گستاخانہ رویہ اپنانا شروع کر دیا۔ کوئی بھی والد ایسی اولاد کو پسند نہیں کرتا۔ ایسی اولاد جو لوگوں کو اپنے والد کے خلاف بھڑکائے اور بہتان تراشیاں کرے، ممکن نہیں کہ والد کے دل میں جگہ بنا پائے۔ پہلی بیوی سے اقبال کا تعلق پہلے ہی ناخوش گوار تھا۔ انگلستان سے اقبال کی واپسی پر دونوں کے درمیان دُوری اور بھی بڑھ گئی۔ شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد کی کوششوں کے باوجود کریم بی بی اور اقبال ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے والدین کے ہاں ہی رہتی تھی۔[۱۹] یوں اقبال نے اپنی پہلی بیوی (کریم بی بی) سے علیحدگی کے بعد آفتاب اقبال سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اس ضمن میں ۱۹۶۷ء میں ''علامہ اقبال اور اُن کی پہلی بیوی'' کے عنوان سے سید حامد جلالی کی ایک کتاب سامنے آئی جس میں الزام لگایا گیا کہ اقبال نے پہلی بیوی سے ناانصافی کی اور اپنے بیٹے آفتاب کو وراثت سے محروم رکھا۔ پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر نے اپنی کتاب ''اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ'' میں یہ دعویٰ کیا کہ علامہ اقبال کی پہلی شادی کے متعلق کتاب کے حقیقی مصنف اور ناشر دراصل شاعر مشرق کے بیٹے آفتاب اقبال تھے۔ اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن بیگم آفتاب اقبال نے شائع کیا اور اس کتاب میں علامہ اقبال پر وہی الزامات لگائے گئے جو بھارتی مصنف اقبال سنگھ کی کتاب ''پُرجوش مسافر'' میں لگائے گئے۔ کئی مصنّفین نے لکھا ہے کہ آفتاب اقبال اپنی والدہ کریم بی بی کو مظلوم اور والد کو ظالم سمجھتے تھے۔ اپنی بدتمیزیوں کے باعث والد کے دل سے اتر گئے اور والد کی موت کے کئی سال بعد کسی دوسرے نام سے خود والد کے خلاف کتاب لکھ ڈالی۔[۲۰]

آخری اعتراض کہ استعماری طاقت سے 'سر' کا خطاب آخر کس مصلحت کے تحت قبول کیا؟ علامہ اقبال کو 'سر' کا خطاب یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو ملا۔ خطاب ملنے پر مخالفین کو اُن کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک بہترین ہتھیار مل گیا۔ مخالفین نے اُن پر انگریز پرستی کا الزام لگایا۔ حتیٰ کہ اقبال کے ایک نیاز مند عبدالمجید سالک نے بھی ایک ہجویہ اور طنزیہ نظم اور اپنے فکاہیہ کالم 'افکار و حوادث' میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اس ضمن میں اقبال کو باقاعدہ وضاحت دینا پڑی۔ حالانکہ مولانا شبلی نعمانی جو حکومت وقت کے زبردست مخالف تھے، شمس العلما کا خطاب ملا۔ یہ بھی درست ہے کہ سرسید احمد خاں کو حکومت کی معاونت کے صلے میں سر کا خطاب ملا لیکن اقبال تو مغرب کے شدید ناقد تھے جس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں پہلے بھی کر چکے تھے۔

اس ضمن میں اُن کی نظمیں 'خضر راہ'، 'سرمایہ و محنت'، 'طلوع اسلام'، 'تصویر درد' اور 'شمع و شاعر' کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اقبال کو سر کا خطاب ملنا علمی اور ادبی خدمات کی بنا پر تھا نہ کہ حکومتی خدمات کی بنا پر۔ دوسرے اقبال کی افتادِ طبع

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

بھی کھلے انکار سے مانع تھی۔ انھوں نے پہلے گورنر سے انکار کیا اور کہا کہ میں خطابات و اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا، لیکن وہ دل شکنی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا گورنر کے مکرر استفسار پر اقبال نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اس حوالے سے انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا کہ کھلی کھلی جنگ میری فطرت کے خلاف ہے۔[۲۱] حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کا سہرا 'اسرار خودی' کے سر ہے۔ اسی بنا پر دیارِ اغیار میں بھی اقبال شناسی کے دور کا آغاز ہوا اور اُن کے فن اور فکر کا جائزہ لینے کا سلسلہ شروع ہوا جو تا حال جاری ہے اور مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شفیق عجمی کی کتاب "اقبال شناسی: عالمی تناظر میں" اِس کا بین ثبوت ہے۔ جس میں انھوں نے اہم مغربی ممالک، سوویت یونین، مصر، ترکی، ایران اور بھارت میں اقبال شناسی کی کاوشوں کا اجمالی تعارف اور جائزہ پیش کیا ہے۔

حواشی

۱۔ محمد خاور نوازش، "اقبال: 'اسرار خودی' سے 'تاریخِ تصوف' تک (ایک بازیافت)" مشمولہ "تحقیق نامہ" ۱۶، جنوری ۲۰۱۶ء (لاہور: شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی)، ص ۲۶

۲۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، "طیفِ نثر"، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری (لاہور: لاہور اکیڈمی، طبع ثانی ستمبر ۲۰۰۲ء) ص ۱۶۳۔۶۴

۴۔ عبدالمجید سالک، "ذکرِ اقبال" (لاہور: بزمِ اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳ء) ص ۵۸

۵۔ ڈاکٹر تالیا پری گارینا، "مرزا غالب" (مترجم) محمد اسامہ فاروقی (کراچی: مکتبہ دانیال ۱۹۹۸ء) ص ۲۷۱

۶۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان) (۱۹۷۷) ص ۸

۷۔ ایضاً، ص ۱۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۹۔ سید عبدالواحد معینی، مقالاتِ اقبال (لاہور: آئینہ ادب ۱۹۸۸ء) ص ۲۰۶

۱۰۔ شائستہ خاں، اسرار خودی۔ فراموش شدہ ایڈیشن (مرتبہ) (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۳ء) ص ۱۱

۱۱۔ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، محولہ بالا ۴، ص ۴۹

۱۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد دوم (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء) ص ۴۹۵

۱۳۔ زیب النسا، اقبال کی اُردو نثر: ایک مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء) ص ۳۰۵

۱۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون، اقبال کا شکوہ اور جوابِ شکوہ (اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا مرثیہ) مشمولہ، قومی زبان، نومبر ۲۰۱۳ء، جلد ۵۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۹ تا ۴۳

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۵۔ عابد علی عابد، شکوہ، جوابِ شکوہ (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۷۰) ص ۵۶
۱۶۔ نثار احمد قریشی (مرتب) علامہ اقبال (صوفی تبسم کی نظر میں)، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳) ص ۲۷۔۲۸
۱۷۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال۔ شخصیت اور فن (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء) ص ۱۲۰
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔۲۶
۱۹۔ ڈاکٹر جاوید اقبال [illegible]، ۲۰۰۴ء) ص ۲۰۰
۲۰۔ حامد میر، روزنامہ جنگ، ۹ نومبر ۲۰۱۵ء، کالم بعنوان ''اقبال کی ازدواجی زندگی کا بحران''
۲۱۔ شیخ عطا اللہ (مرتب) اقبال نامہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء) ص ۲۱۲

مآخذ

۲۔ انجم، خلیق، ڈاکٹر (مرتب) غالب کے خطوط، جلد دوم، نئی دہلی: غالب انسی ٹیوٹ، ۱۹۸۵
۳۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، علامہ اقبال: شخصیت اور فن، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۲۰۱۰ء
۴۔ زیب النسا، ''اقبال کی اُردو نثر: ایک مطالعہ''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء
۵۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، طیفِ نثر (مرتبہ) ڈاکٹر ممتاز منگلوری، لاہور: لاہور اکیڈمی، طبع ثانی ستمبر ۲۰۰۲ء
۶۔ خاں، شائستہ، اسرارِ خودی: فراموش شدہ ایڈیشن (مرتبہ) نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۳
۷۔ عطاء اللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء
۸۔ سالک، عبدالمجید، ذکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳
۹۔ احسن، عبدالشکور، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷
۱۰۔ معینی، عبدالواحد، سید، مقالاتِ اقبال، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء
۱۳۔ پری گارینا، نتالیا، ڈاکٹر، مرزا غالب (مترجم) محمد اسامہ فاروقی، کراچی: مکتبہ دانیال ۱۹۹۸ء
۱۴۔ قریشی، نثار احمد (مرتب) علامہ اقبال (صوفی تبسم کی نظر میں)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء

رسائل و جرائد

۱۔ ''تحقیق نامہ ۱۶''، جنوری ۲۰۱۶ء، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور
۲۔ روزنامہ ''جنگ''، ۹ر نومبر ۲۰۱۵ء
۳۔ ماہنامہ ''قومی زبان''، نومبر ۲۰۱۳ء، جلد ۵۸، شمارہ ۱۱، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی